۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۱ء

اس شمارے میں

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۳۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۴۰

اداریہ

اترپردیش کے اردو دوستوں سے

(۱)

اترپردیش میں اردو دوستوں کی تعداد، دوسری تمام ریاستوں سے زیادہ ہے۔ یہ آبادی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۷۸ لاکھ تھی اور ۱۹۷۱ء کی مردم شماری میں ایک اندازے کے مطابق ایک کروڑ کے لگ بھگ ہوگی۔ آبادی کے لحاظ سے اردو بولنے والی آبادی، کل آبادی کا آٹھواں حصہ ضرور ہوگی۔ دوسرا نمبر بہار کا ہے جہاں کی اردو بولنے والی آبادی ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق چالیس لاکھ سے اوپر تھی۔ اس کے بعد بیس لاکھ سے زیادہ آبادی کی ریاستیں آندھرا، مہاراشٹر اور میسور ہیں۔ اردو دوستوں نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ اردو جتنی خوار اور زبوں اترپردیش میں ہے اتنی کسی دوسری ریاست میں نہیں، یہ تو درست ہے کہ اترپردیش کی حکومت کا رویہ آزادی کے بعد سے اردو کے ساتھ بے انصافی کا رہا ہے، مگر دوسری ریاستوں کے ارباب اقتدار بھی سب کے سب انصاف کے پتلے نہیں رہے ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ اترپردیش میں پرشوتم داس ٹنڈن اور سمپورنانند جی نے ایک ایسی پالیسی چلائی جو اردو کے حقوق کو نظر انداز کرنے پر مبنی تھی، پھر بھی یہ ساری حقیقت نہیں ہے، اردو کی اس زبوں حالی کی کچھ نہ کچھ ذمہ داری خود اترپردیش کے اردو بولنے والوں پر بھی عاید ہوتی ہے جمہوریت میں خواہ وہ کیسی ہی نامکمل اور ادھوری کیوں نہ ہو، عوام کی مرضی کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ یہ کہے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ تقسیم کے بعد جو تنگ نظری اور تعصب کی لہر اکثریت میں اردو کے خلاف پیدا ہوئی، وہ اگرچہ کم ہوئی ہے، مگر ابھی گئی نہیں، چنانچہ اترپردیش کی اکثریت جو ہندی بولتی ہے، یہ کہتی ہے کہ ہندی اور صرف ہندی کو اترپردیش میں فروغ ہونا چاہیے، اردو دوست اگر ایک طرف بہت بڑی تعداد میں اپنے اردو اسکول چلاتے اور دوسری طرف عام اسکولوں میں اردو کی تعلیم کے لئے ہر ضلع، ہر شہر اور ہر قصبے میں مقامی حضرات کے ذریعے سے جدوجہد کرتے تو صورت حال بالکل نہیں تو بڑی حد تک مختلف ضرور ہوتی مگر زیادہ تر اردو دوستوں نے یا تو حکومت کو توجہ دلانا کافی سمجھا، یا صرف اخباروں اور جلسوں میں احتجاج کرکے یا کچھ مظاہرے کرکے خاموش ہوگئے، یا اردو کو صرف مسلمانوں کا مسئلہ بنا کر پیش کیا، یا کسی سیاسی پارٹی سے وابستگی کی بنا پر یہ سمجھا کر ان کی پارٹی کے سوا دوسری پارٹیاں قطعاً ناقابل اعتبار ہیں اور ان کی پارٹی کے برسر اقتدار آتے ہی،

فی کاپی: ۱۵ پیسے
قیمت سالانہ: ۸ روپے

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

اشاعت کی تاریخیں
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

سارے مسائل حل ہو جائیں گے اور اردو کو اس کے سارے حقوق خود بخود مل جائیں گے۔ یہ بھی ہوا کہ ایک بڑی تعداد نے حالات سے جلد سمجھوتہ کر لیا اور یہ سمجھ لیا کہ چونکہ اردو پڑھنے سے نوکری نہیں ملے گی اس لئے اردو پڑھ کر کیا کریں گے، فارسی پڑھ کر تیل تو بیچ لیتے، اردو پڑھنے سے یہ بھی نہ ہو سکے گا۔ غرض ہمارے نزدیک اردو کی اترپردیش میں خواری اور زبوں حالی کی ذمہ داری بڑی حد تک حکومت اور اکثریت پر ضرور ہے، مگر اس کے لئے خود اردو والے بھی ضرور قصوروار ہیں۔ اگر انھیں اپنی زبان عزیز ہے تو اس کے پڑھنے پڑھانے کا انتظام بھی انھیں کرنا ہے، جو حکومت کرے اس سے وہ کرانا ہے اور باقی خود کرنا ہے۔ یہاں حال یہ ہے کہ خود بہت کم ہوا ہے اور حکومت پر تکیہ زیادہ ہے۔ یہ میلان اب بدل دینا چاہیے، حکومت سے مطالبہ تو جاری رہنا چاہیے اس کے علاوہ اکثریت کو اردو کے قومی رول سے برابر آگاہ کرتے رہنا چاہیے اور پھر (اور یہ پھر بہت اہم ہے) اپنے طور پر یہ طے کر لینا چاہیے کہ ہمیں خود بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ اپنے اسکول کھولنے ہیں، اسکول کے اوقات کے علاوہ اردو کی تعلیم کا انتظام کرنا ہے، مناسب کتابیں تیار کرنا ہیں، استادوں کی تربیت کرنا ہے، پھر ان لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد کے لئے کوئی نہ کوئی روزگار بھی مہیا کرنا ہے۔ اس لئے پہلے یہ طے کرنا ہے کہ اردو کو باقی رکھنا ہمارا فرض ہے اور ہم اس فرض کو پورا کریں گے، دوسرے جذباتیت کے بجائے سنجیدگی سے ایسا عملی پروگرام بنانا اور چلانا ہے کہ ہم اردو کو اترپردیش میں زندہ رکھ سکیں۔ اس پروگرام پر اگلی اشاعت میں روشنی ڈالی جائے گی۔

(باقی صفحہ ۱ سے آگے)

اس مرد جلیل نے اپنے خون جگر سے کی ہے اور اس کے کیوں اور کس لئے پر غور نہ کریں۔

جو ادارہ سرسید نے مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لئے بنایا تھا۔ اس لئے بنایا تھا کہ وہ ہندوستان کی ایک پس ماندہ اور پسی ہوئی جماعت کو مغربی علوم اور فکر سے آشنا کر سکیں۔ اس کا آغاز سرسید کے اس خواب سے ہوا تھا جس کا ذکر انھوں نے ۱۸۷۲ء کے ایک مضمون میں اس طرح کیا ہے:

"میرا یہ خواب بعضوں کو شیخ چلی کا خواب معلوم ہوگا لیکن ہم ایم۔ اے۔ او کالج کو آکسفورڈ اور کیمبرج کے نمونے کی یونیورسٹی بنانا چاہتے ہیں۔"

حضرات! اس خواب کی تعبیر کی ذمہ داری سرسید پر نہیں موجودہ نسل پر ہے۔

سرسید ہندوستان کے اس آکسفورڈ اور کیمبرج میں ایک ایسے مسلمان کی تشکیل کرنا چاہتے تھے جو نہ مغرب سے بیزار ہو نہ مشرق سے منحرف ہو۔ جس کے اردگرد اس کی قومی زندگی کا وسیع تر دائرہ ہو۔ ۱۸۸۴ء میں لاہور کے ایک اجتماع میں انھوں نے یہ بات بڑی گرج کے ساتھ کہی تھی:

"مجھے اس بات سے دلی صدمہ پہنچے گا اگر ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال کیا جائے کہ ایم۔ اے۔ او کالج اس لئے قائم کیا گیا ہے کہ ہندو مسلمانوں میں تفریق پیدا ہو۔"

ہندوستان کا شاید ہی کوئی تعلیمی ادارہ ایسا ہو جس میں مسلسل غیر مسلموں اور مسلمانوں کے تناسب کو اس انداز میں قائم رکھا گیا ہو جیسا کہ علی گڑھ میں ابتدا سے ملتا ہے۔ اس کے طالب علموں میں ہمیشہ ایک خاص تناسب غیر مسلموں کا رہا ہے۔ اس کے اساتذہ میں ہمیشہ غیر مسلم اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ اس کا پہلا گریجویٹ ایک غیر مسلم تھا۔ ابتدائی مراحل میں اس کا سب سے بڑا عطیہ وزیانگرم کے مہاراجہ نے دیا تھا۔

حضرات! علی گڑھ کے اسی تاریخی دو رنگ میں اس ادارہ کا اثبات ہے۔ یہی دو رنگی اس کی تقدیر ہے۔ اسی میں اس کی نجات مضمر ہے۔ جب کبھی اس کے ان اجزائے ترکیبی میں انحراف آیا ہے وہی گھڑیاں اس پر شاق گزری ہیں۔ لیکن انحراف کا یہ دور دیرپا نہیں رہا۔ اسے اس کے سواد اعظم کی نیک نیتی کہیے یا اس کا فیضان، اس ادارہ نے ہر پر آشوب دور کو ہموار کر لیا ہے اور ہر موج بلا کو اپنے لئے ساز گار بنا لیا ہے۔

دوستو! مجھے یقین ہے کہ کسی قسم کی قانونی موشگافیاں اس ادارہ کی تاریخ، ترکیب اور اسپیشل کریکٹر کو نہیں بدل سکتیں!

اسی طرح اس کے نادان دوستوں کی کوئی سیاسی بازی گری اسے قومی ڈگر سے نہیں ہٹا سکتی۔

ہمیں اس کے محور اور سواد اعظم دونوں کی ضمانت کرنا ہوگی اور دونوں کو ایک دوسرے سے مربوط رکھنا ہوگا کہ یہی راہ سید ہے اور یہی یوم سرسید کا سب سے اہم عہد و پیمان ہے!

ڈی۔ اے ہیرسن قربان

ایک باکمال عیسائی شاعر

نادر شاہجہانپوری مرحوم

اردو زبان روز پیدائش سے سیکولر رہی ہے، وہ کبھی کسی ایک فرقہ کی یا جماعت کی زبان نہیں رہی۔ اس کی نشوونما ترقی و فروغ بلا تخصیص مذہب و ملت مختلف تہذیب و کلچر کے افراد کے ہاتھوں ہوا اس سلسلہ میں عیسائی صاحبان ذوق نے بھی اس چمنستان کی آبیاری کی ہے۔ آج ہم ناظرین کو ایک ایسے باکمال مسیحی شاعر سے متعارف کراتے ہیں جس نے تمام عمر زبان و ادب کی خدمت کی لیکن ناموافق حالات نے اسے غیر معروف ہی رکھا۔ جس کا اظہار انھوں نے اپنے ایک خط میں کیا ہے "زمانے میں ہماری قوم کو فنکار کی قدر نہیں۔ میرا دیوان اب میرے ساتھ مر جائے گا۔ اس طرح میں ڈبل ڈیتھ (DOUBLE DEATH) مر جاؤں گا" یہی حسرت ان کے اشعار میں بھی جھلکتی ہے ؎

قدرداں ہی کوئی نہیں نادر
کیا نتیجہ گہر فشانی کا
ہم نے مانا نادر نادار مر جائیں گے کیا
یہ ہمارے شعر بھی دل سے اتر جائیں گے کیا

اس باکمال شاعر کا نام جان رابرٹ پال اور تخلص نادر ہے اصل وطن موضع رامپور روضہ تحصیل ضلع شاہجہانپور ہے، اسی مناسبت سے شاہجہانپوری کہلائے۔ ان کی پیدائش اسی موضع میں ۲۶ر فروری ۱۸۸۹ء میں ہوئی۔ والدین نے مسیحی مذہب قبول کر لیا تھا۔ بچپن ہی میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور وہ بے سہارا ہو گئے اس لئے ان کی پرورش لودی پور ضلع شاہجہانپور کے مشن یتیم خانے میں ہوئی۔

سنہ ۱۹۰۷ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور تکمیل مڈل اسکول میں مدرس ہو گئے سنہ ۱۹۱۰ء میں شادی ہوئی اور بسلسلہ ملازمت سنہ ۱۹۱۷ء سے مستقل طور پر جھانسی میں سکونت اختیار کر لی اور وہیں ۳۱ر مئی سنہ ۱۹۶۳ء کو وفات پائی۔

زمانہ طالب علمی سے شوق سخن پیدا ہوا۔ جماعت میں پروفیسر الٰہی بخش قرین نیازی ان کے استاد نے اس مصرعہ پر مصرعہ لگانے کا حکم دیا ؎ ہو گئے پتھر ہی پتھر زیر پا بالائے سر۔ آپ نے کچھ دیر فکر کی اور فی البدیہہ یہ مصرع کہا ؎

کوہ غم سر پہ لئے فرہاد پہنچا کوہ پر
ہو گئے پتھر ہی پتھر زیر پا بالائے سر

ابتداء میں قرین نیازی کی راہنمائی میں فارسی زبان میں شعر کہنا شروع کیا پھر انھیں کے ایماء پر سنہ ۱۹۱۲ء سے اردو میں طبع آزمائی کرنے لگے پھر علامہ خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی کی طرف رجوع ہوئے۔ عشرت مرحوم نے کچھ پس و پیش کے بعد آپ کو اپنی شاگردی میں قبول کر لیا اور سنہ ۱۹۱۷ء میں یہ کہہ کر کہ آپ اب خود استاد ہیں اصلاح سے مستغنی کر دیا۔

آپ کے کلام کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے مذہبی یعنی نعتیہ اور غیر مذہبی۔ نعتیہ کلام سے آپ کے اعتقاد، ایمان اور حضرت مسیح سے والہانہ محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

فلک سے مرد ار تجھ کو خدا نے
گناہوں نے میرے اتارا مسیحا
گر ابن خدا کی ولادت نہ ہوتی
گنہگار انساں پہ رحمت نہ ہوتی
مسیحا جو درس محبت نہ دیتا
تو انساں میں آدمیت نہ ہوتی
دار پر تو نے بہا کر خون پانی اس قدر
کر دیا ہے نار دوزخ کو دھواں میرے لئے
مسیحا سا نہیں ہمدرد بدکاران عالم کا
نہ آیا جان دینے کوئی دم دینے ہزار آئے

آفتاب شمسی

غزل

صدا انا الحق سے روح کی بدن دیکھوں
بدل کے اب کے برس یہ بھی پیرہن دیکھوں

کمال ہے کہ چلوں جب تلاش میں اپنی
نشان اپنے ہی قدموں کے خونگن دیکھوں

لگا ہے ماضی مرے پیچھے سانپ کی صورت
نکل کے کیوں نہ میں اک بار اس کا پھن دیکھوں

عجیب شہر ہے سب اجنبی سے لگتے ہیں
یہاں میں اپنی طرح کوئی بے وطن دیکھوں

اسے یہ ضد کہ میں ٹھہرا رہوں یہیں کچھ دیر
مجھے یہ فکر کوئی اور انجمن دیکھوں

اب اس کے بعد بہت ہی گھنا اندھیرا ہے
میں کس نگاہ سے یہ ڈوبتی کرن دیکھوں

اقوالِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور کچھ انجیلی واقعات کو
ھوں نے یوں شعر کا پیکر بخشا ہے ؎

دیکھنا غیر دل کا تنکا بعد ازاں
پہلے اپنی آنکھ سے شہتیر کھینچ

غیر مذہبی شاعری میں درد و مایوسی کا عنصر غالب ہے۔
ادر کا کلام آپ بیتی معلوم ہوتا ہے جس میں آمد ہی آمد نظر آتی
ہے ان کے یہاں کچھ اشعار میر تقی میر اور فانی بدایونی کے رنگ
ی بھی ملتے ہیں مثلاً ؎

جینے جی اٹھ سکا نہ اس در سے
سر پہ احسان ہے ناتوانی کا
آپ پر کیوں اثر نہیں کرتا
میرا رونا بھری جوانی کا

ارمان آج شب جو ہمارے اداس ہیں
جتنا بے غم سے زرد ستارے اداس ہیں

م اخیر بھی کچھ کچھ بہار باقی ہے
نظر نہیں ہے مگر انتظار باقی ہے

چھوٹی بحروں میں بڑے دلکش اشعار کہے ہیں ؎

زندگی ہو کے تم نہ ہو خفا کیوں نہ بے موت مر جائیے
ر عالم میں کیا ہوا باندھے نقشِ خاکی حباب پانی کا

تڑپتا ترے عشق میں زندگی بھر
مجھے کاش مرنے کی فرصت نہ ہوتی

ت سے عفوِ گناہ کیا مانگیں حوصلہ بار بار کیسے ہو
نے والے تو بیدل نہ ہو ہے پسِ مرگ بھی زندگی

نادر کا کلام لفظی و معنوی خوبیوں، صنائع و بدائع سے
ہے۔ زبان نہایت سلیس، لطیف، صاف و عام فہم بامحاورہ
شستہ و شگفتہ ہے نادر کے کلام میں جا بجا سہلِ ممتنع کے
نے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ فصاحت و بلاغت بھی کلامِ نادر
رہ امتیاز ہے ؎

خدا رزاق ہے گو دشمن سارا زمانہ ہے
مرے ہی منہ میں آئے گا جو میرے منہ کا دانہ ہے

وہ اپنا دستِ شفقت رکھیں کہاں کہاں
بانسوں اچھل رہا ہے دل کا نہیں ٹھکانہ

دیکھوں گا یا خدا رُخِ پُر نورِ یار کب
کالا کرے گی منہ یہ شبِ انتظار کب

منہ کھول کے کچھ مانگیں یہ کام نہیں کرتے
ہم شانِ کریمی کو بدنام نہیں کرتے

کلام میں ایک ہلکا ٹھہراؤ، وقار اور خاص قسم کی
سنجیدگی پائی جاتی ہے ؎

سبکسار کی آبرو خاک ہے
جو موجوں سے کھیلے وہ پیراک ہے

لوحِ دل پر لکھ لے یہ تحریر اپنے ہاتھ سے
خود بناتا ہے بشر تقدیر اپنے ہاتھ سے

کیوں تجھے ہے عمرِ فانی پر گھمنڈ
چار دن کی زندگانی پر گھمنڈ

نادر مرحوم کے کلام کی قدر دانی اور دیوان کی
اشاعت کے لئے پنڈت نہرو کے ایماء پر یوپی سرکار
نے دو ہزار روپیہ منظور فرمایا تھا۔ آپ کو رقم کی وصولیابی
کے لئے ایک ماہ بعد لکھنؤ طلب کیا گیا تھا مگر موت نے
ان کو ایک ماہ کی مہلت نہ دی اور دیوان شائع کرانے
کی حسرت پوری نہ ہو سکی۔ بقول خود ؎

روح اڑ جائے گی نقش بے تواں رہ جائے گی
کارواں جائے گا گرد کارواں رہ جائے گی

شناکس کا

BRIDES MIRROR
یعنی
مراۃ العروس کا انگریزی ترجمہ

میں ابھی پچھلے دنوں عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری میں ایک صاحب ذوق کے لئے ایسی کتابوں کی تلاش کر رہی تھی جن میں "تاریخ ہند، اردو ادب کی روشنی میں" کے موضوع پر کچھ مواد ہو اس موضوع پر تو کچھ نہیں ملا لیکن ایک اور کتاب پر نظر پڑی جس کا نام BRIDES MIRROR ہے اور عنوان کے نیچے یہ عبارت درج ہے TRANSLATED FROM THE HINDUSTANI اس کتاب کے مصنف ڈاکٹر نذیر احمد اور مترجم جی، ای وارڈ (ریٹائرڈ) ہیں۔

مراۃ العروس تقریباً ۱۸۶۵ — ۶۶ میں لکھی گئی اور ۱۸۶۹ء میں پہلی بار طبع ہوئی اگرچہ اس کی اشاعت کو ایک سو سال ہو چکے ہیں لیکن اب بھی اس کا شمار زندہ کتابوں میں کیا جا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا ترجمہ ۱۹۰۳ء میں لندن کے ہنری فرو ڈ نے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے طبع کر کے شائع کیا ہے۔ آغاز کتاب سے پہلے مترجم نے مختصر سے نوٹ میں یہ صراحت کی ہے۔

"یہ ترجمہ اصل کتاب کے رومن رسم الخط میں شائع کئے گئے ایک اڈیشن کا ضمیمہ ہے جو کہ ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا ہے اس کا مقصد ہندوستانی زبان کے طلبہ کے لئے ایک نصابی کتاب کی فراہمی ہے۔ اس کی ادبی خوبی کا تو دعویٰ نہیں ہے تاہم انگلستان میں ہندوستانی رعایا کی سماجی اور خانگی زندگی کے متعلق اس قدر کم معلومات ہیں کہ اب اس کے ایک رخ کے متعلق ایک ممتاز مسلم جنٹلمین کا لکھا ہوا مستند بیان غالباً عمومی طور سے بھی برطانوی عوام کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔"

اس تعارف کے علاوہ کتاب سے مترجم یا ترجمہ کے متعلق کوئی اور تفصیل نہیں ملی۔

البتہ حیات النذیر مرتبہ افتخار عالم میں کچھ تفصیل ملتی ہے جو حسب ذیل ہے۔

"مراۃ العروس چھپنے کے نو برس بعد کیمپسن صاحب نے ترجمہ کی خواہش کی ۲۰ دسمبر ۱۸۷۸ء کو لندن سے انھوں نے مولانا کو خط لکھا کہ مراۃ العروس کا ترجمہ کر رہا ہوں اور میری میز پر مراۃ العروس، توبۃ النصوح اور بنات النعش رکھی ہیں، جب کیمپسن صاحب نے مراۃ العروس کو انگریزی میں ترجمہ کرنے کی اجازت مانگی تو مولانا نے جواب دیا "میں بھی آپ کا مراۃ العروس بھی آپ کی، اور شہرت بھی آپ ہی کی دی ہوئی پھر مجھ سے طلب اجازت فضول شوق سے ترجمہ کر لیجیے آپ کو اجازت کی کیا ضرورت ترجمہ کیجیے اور شوق سے ترجمہ کیجیے۔"

حیات النذیر مرتبہ افتخار عالم سے پتہ چلتا ہے انگریزی کے علاوہ اور لوگوں نے بنگالی، گجراتی، بھاشا، پنجابی، کشمیری زبانوں میں بھی مولانا کی اجازت سے مراۃ العروس کے ترجمے کئے۔ ڈپٹی کمشنر انبالہ کیمپسن صاحب نے مراۃ العروس کو رومن حروف میں طبع کرایا، کیمپسن صاحب کے انتقال کے بعد پادری وارڈ صاحب ایم۔ اے کیمبرج یونیورسٹی نے بھی اس کو رومن میں چھپوایا اور جس طرح کیمپسن صاحب نے توبۃ النصوح کی شرح لکھی تھی پادری صاحب نے بھی اس کی شرح مع ترجمہ نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھی۔"

غالباً زیر نظر کتاب ہی مذکرہ بالا ترجمہ ہے۔ اس ترجمہ کا سن اشاعت ۱۸۹۹ء ہے اور ترجمہ میں کتاب، مصنف یا مترجم کے متعلق کوئی تفصیل شامل نہیں کی گئی ہے سوائے مترجم کے مختصر سے نوٹ کے جس کا ترجمہ اوپر دیا گیا ہے اس ترجمے کی اہم خصوصیت اس کے فٹ نوٹس ہیں۔ ان فٹ نوٹس میں ہندوستانی تمدن سے متعلق الفاظ کے معنی دئے گئے ہیں، خاص طور سے ایسے الفاظ کی تشریح کی گئی ہے جو غیر ہندوستانیوں کے لئے نئے ہیں جیسے ہندوستانی پکوانوں کے نام وغیرہ۔ ہندوستانی رقوم، فاصلے اور مقدار کے پیمانوں کی تشریح کے ساتھ ان کے متبادل رقوم، فاصلوں اور مقداروں کے پیمانوں کو بتا دیا گیا ہے۔ اہم شہروں، نیز دہلی کے اہم محلوں کی تفصیل بتائی گئی ہے۔ جیسے سبزی منڈی کے متعلق مختصر سی تفصیل درج ہے۔

الفاظ کے معنی کے علاوہ فٹ نوٹس میں اسمائے خاص کا تلفظ بھی بتلایا گیا ہے جس کا منشا یہی ہوگا کہ ہندوستانی زبان سیکھنے والوں کو مدد ملے۔

(باقی صفحہ پر)

مترجم: رحیم ناظم دت

رگ وید۔ منتر ۳۲

اندرا دیوتا

۱۔ میں زرہ پوش اندرا کے اُن بہادرانہ کارناموں کا ذکر کروں گا جو اس سے ظہور میں آئے۔

اس نے میگھ[۱] پر قابو پالیا، بند پانیوں کو کھول دیا اور پہاڑی نالوں کے سیلاب کو ندیوں کی شکل دے دی۔

۲۔ اس نے وشکرما کے بنائے ہوئے رعد[۲] سے پہاڑوں پر چھائے ہوئے بادلوں کو مار گرایا۔

بچھڑے کے پیچھے بھاگتی ہوئی کلکارتی گائے کی طرح پہاڑوں سے نکلے ہوئے پانی تیز روی سے سمندر کی طرف رواں ہیں۔

۳۔ سانڈ کی سی تیزی و تندی سے اس نے سوم رس چھین لیا اور تین گھونٹ میں ہی اسے چٹ کر گیا۔

شاہ زور اندرا نے رعد کو تھاما اور اس سے بادلوں کے پلوٹھے کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

۴۔ اندرا نے جب بادلوں کے پلوٹھے کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس فسوں گر کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔

تو سورج، شفق اور آسمان میں جان پڑ گئی اور اس کے مقابلے میں کوئی دشمن نہ رہا۔

۵۔ اندرا نے اپنی بھیانک گرج سے ورترا[۳] کو پاش پاش کر دیا۔ مردود ورترا کو۔

اور وہ درخت کے اس تنے کی طرح جو کلہاڑی سے کاٹ دیا گیا ہے، زمین پر اوندھا پڑا ہے۔

۶۔ ناقص العقل اور ناتواں ہونے کے باوجود ورترا نے خشم ناک اور مردم کش اندرا کو للکارا۔

وہ مقابلے کی تاب تو نہ لا سکا مگر گرتے گرتے پایاب نالوں کو روند گیا۔

۷۔ ننگا ہو جانے کے باوجود اس نے اندرا کو ایک بار پھر مقابلہ کے لئے پکارا۔

چھوٹتے ہی اندرا نے اس کے کندھوں کے درمیان رعد مارا۔

اپاہج تو تھا ہی، پھر بھی بہادری کی ڈینگیں مارتا رہا، یہاں تک کہ ورترا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر زمین پر بدحال پڑا ہے۔

۸۔ طغیانی میں کناروں کو پھاند کر بہتی ہوئی ندی کی طرح وہ وہاں پڑا تھا اور پانی بے خوف و خطر اس کے اوپر بہہ رہا تھا۔

جس پانی کو ورترا نے زبردستی روک رکھا تھا، انہی پانی کے پاؤں تلے وہ دب گیا۔

۹۔ پھر ورترا کی ماں کا گھمنڈ بھی ٹوٹ گیا، اندرا نے اپنا مہلک ہتھیار اس پر چلایا۔

ماں اوپر تھی اور بیٹا نیچے اور وہ اس طرح پڑی تھی جیسے گائے اپنے بچھڑے کے پاس پڑ جاتی ہے۔

۱۰۔ پانی ورترا کے اوپر سے متواتر و مسلسل ستائے بغیر تیز رفتاری سے بہے جا رہا تھا اور اندرا کا پرعیب دشمن تاریکی میں ڈوبا پڑا تھا۔

۱۱۔ قید میں پڑے غلاموں اور لٹیروں کے ہاتھ آئی گایوں کی طرح پانی بھی بند پڑے تھے۔

جب ورترا کا خاتمہ ہو گیا تو ان بند پڑی غاروں کے منہ بھی کھول دئے۔

۱۲۔ اے اندرا! لاثانی دیوتا! جب تیرے رعد پر اس نے حملہ کیا تو نے گھوڑے کی دم کا روپ بھر لیا۔

تو نے گائیں بھی واپس لے لیں، سوم رس بھی چھین لیا اور تو نے سات دریاؤں کو بھی رواں کر لیا۔

۱۳۔ ورترا کو نہ تو بجلی، نہ اولیں، نہ کہرے جن پر وہ امید لگائے بیٹھا تھا، کوئی فائدہ پہنچا پایا۔

جب ورترا اور اندرا نبرد آزما تھے تو ماگھاوان[۴] نے آخری فتح پائی۔

۱۴۔ دشمن کے خاتمہ کے بعد اے اندرا! تیرے دل میں کیا خوف پیدا ہوا؟ کیا تجھے اس کا کوئی حامی دکھائی دیا تھا۔

دہشت زدہ باز کی طرح، جو فضاؤں کو چیرتا اڑا جاتا ہے، تو نے بھی ۹۹ بہتے دریا ایک ہی جست میں پار کر لئے۔

۱۵۔ اندرا! متحرک و غیر متحرک، پالتو اور غیر پالتو مخلوق کا تو ہی مالک ہے۔

انسانوں پر تو بااختیاروں کی طرح حکومت کرتا ہے، پہیئے کے دھرے کی طرح ہر شے میں گھر کئے ہوئے ہے۔

۱۔ جدل

۲۔ دیوتاؤں کا اسلحہ ساز۔ یونانی اسے ہی فیس ٹس اور رومن ولیکان کہتے ہیں۔ اس نے منورس (یونانی دیوتا) اور جوپیٹر (رومن دیوتا) کے لئے رعد بنایا تھا۔ اندرا کو ان دونوں دیوتاؤں سے بہت مماثلت ہے۔

۳۔ خشک سالی۔

۴۔ اندرا کا دوسرا نام ہے، اسے ماگھاوان بھی کہتے ہیں۔

مراسلات

شمس الضحیٰ کے سلسلے میں

ہماری زبان کے ۸ر اکتوبر ۱۹۸۲ء کے شمارے میں ایک مراسلہ "شمس الضحیٰ کی تلاش" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔
مراسلہ نگار کی اطلاع کے لئے لکھا جاتا ہے کہ یہ کتاب میرے کتب خانے میں موجود ہے۔ جو صاحب اس کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں انھیں لکھنؤ آنے کی زحمت کرنا ہوگی۔ کتاب بھیجی نہیں جاسکے گی۔

لکھنؤ۔ • سید مسعود حسن رضوی

اردو ڈرامے کے مسائل

ہماری زبان (یکم اکتوبر) میں اپنے مضمون "اردو ڈرامے کے مسائل" کے متعلق مراسلہ پڑھا۔
مراسلہ نگار کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں نے صرف "اردو" کے "ادبی" ڈراموں کے متعلق اظہار خیال کیا ہے۔ بلاوین میں درج الفاظ پر غور کیجئے۔ بات واضح ہوجائے گی۔

بھوپال۔ • متین سعید

"بکٹ کہانی" کے مصنف افضل کا وطن نارنول تھا

ایک اہم انکشاف!

قائم نے اپنے تذکرے "مخزن نکات" (مرتبہ مولوی عبدالحق) میں افضل کے وطن کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ "از سکان بلاد شرق" تھا۔ اسی تذکرے کے دوسرے نسخے (مرتبہ اقتدا حسین) میں "از سکان قصبہ جھنجھانہ" درج ہے۔ میر حسن نے اپنے تذکرے "تذکرہ شعرائے اردو" میں افضل کا ذکر تو کیا ہے لیکن اس کے وطن کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ دوسرے تذکروں مثلاً "یادگار شعراء" اور "مجمع الانتخاب" میں افضل کا وطن جھنجھانہ بتایا گیا ہے۔ "آفتاب عالمتاب" اور "روز روشن" کے تذکرہ نگاروں نے افضل کو تھانیسری بتایا ہے۔ واله داغستانی نے اپنے تذکرے "ریاض الشعراء" (جسے قائم کے تذکرے پر بھی تقدم زمانی حاصل ہے) میں افضل کا وطن پانی پت قرار دیا ہے۔ واله کے تذکرے کے علاوہ تین اور تذکروں ("نتائج الافکار" "معدن الجواہر" اور "صبح گلشن") میں بھی افضل کو پانی پتی کہا گیا ہے۔ مولانا محمود شیرانی اور پروفیسر مسعود حسین خاں بھی افضل کو پانی پتی ہی تسلیم کرتے ہیں۔ "بکٹ کہانی" کے نسخہ ۱ (مملوکہ رضا لائبریری رامپور) پر افضل کالپی لکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر انصار اللہ نے اپنے ایک مضمون (مطبوعہ "ہماری زبان" یکم مئی ۱۹۷۱ء) میں افضل کو غازی پور سے منسوب کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالغفار شکیل نے اپنے حالیہ تفصیلی مضمون "بکٹ کہانی کا مصنف اور اس کا وطن" (مطبوعہ "فکر و نظر" جلد ۲۳، شمارہ ۲، ۱۹۸۲ء) میں افضل کو نارنول ثابت کیا ہے اور اس سلسلے میں اکرم رنگی المتخلص بہ قطبی کے "تیرہ ماسہ" سے چند اشعار بھی پیش کئے ہیں جن سے "بکٹ کہانی" کے مصنف کا افضل ہونا اور اس کا نارنول سے تعلق رکھنا ثابت ہوتا ہے۔ شیر درج سے لے کر اب تک کسی بھی تذکرہ نگار یا ادبی مورخ نے افضل کے وطن کے سلسلے میں نارنول کا نام نہیں لیا۔ نارنول ہریانہ کے جنوبی حصے میں راجستھان کی سرحد سے ملا ہوا ایک شہر ہے۔ افضل کے وطن کے بارے میں یہ ایک اہم انکشاف ہے۔ اب تک واله داغستانی کا تذکرہ "ریاض الشعراء" ہی ایک ایسا قدیم ترین تذکرہ خیال کیا جاتا تھا جس میں افضل کے وطن کے بارے میں ایک اشارہ ملتا تھا۔ اکرم رنگی کا "تیرہ ماسہ" جس سے افضل کے وطن کا پتا چلتا ہے واله کے تذکرے سے بھی قدیم تر ہے۔ ڈاکٹر عبدالغفار شکیل کے مضمون نے برسوں بلکہ صدیوں سے لاینحل سوال کو حل کر دیا۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ اکرم رنگی کے اس قدیم ترین حوالے کی روشنی میں اہل ادب و تحقیق افضل کو جھنجھانوی، پانی پتی، تھانیسری، کالپی یا غازی پوری نہیں بلکہ افضل نارنولی ہی تسلیم کریں گے۔

علی گڑھ۔ • مرزا خلیل احمد بیگ

انجمن کی خبریں

انجمن ترقی اردو کی ورکنگ کمیٹی کا وزیر امور داخلہ کے تازہ خط پر غور و خوض

دلی :- انجمن ترقی اردو دلی اسٹیٹ کی ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں جس کی صدارت جناب مالک رام صاحب نے فرمائی ہے مرکزی وزیر امور داخلہ جناب مردھا کے خط کی روشنی میں دلی میں اردو کی پوزیشن کا جائزہ لیا گیا۔ مجلس عاملہ کی رائے تھی کہ انجمن کے گذشتہ مکتوب کے جواب میں جناب مردھا نے دلی ایڈمنسٹریشن کی رپورٹ کی بنیاد پر جو جواب دیا اس میں درج شکایات حقائق کے مطابق نہیں ہیں اور دلی ایڈمنسٹریشن نے وزیر امور داخلہ کو اپنے نوٹ میں بڑی چالاکی کے ساتھ غلط فہمی میں مبتلا کیا ہے۔

ورکنگ کمیٹی نے اس بات پر اظہار تشویش کیا کہ حوض رانی کے گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکول میں اس سال داخل کئے گئے طلبہ کے لئے اب تک اردو ٹیچروں کا انتظام نہیں کیا گیا ہے خوریجی کے اردو ذریعہ تعلیم کے پرائمری اسکول کا معاملہ کھٹائی میں ہے اور ادکھلا کے پرائمری اور میڈیم اسکول کو ہندی میڈیم میں تبدیل کرانے کے فیصلہ پر ابھی تک نہ تو نظر ثانی کی گئی ہے نہ طالب علموں کے لئے کوئی خاطر خواہ انتظام کیا گیا ہے۔

• الجمعیۃ

جلسہ انجمن ترقی اردو شاخ نرمل

نرمل :- زیر صدارت جناب محمد برہان الدین صاحب ایڈوکیٹ و صدر انجمن جلسہ انجمن ترقی اردو منعقد ہوا۔ علی حضری صاحب کنوینر نے گذشتہ جلسہ کی روداد سنائی۔

کمیٹی میں مباحث کے بعد طے پایا کہ مدارس میں بلحاظ تعداد طلبہ اور اساتذہ کا تناسب اور ڈگری کالج میں متوازی اردو جماعتوں کے قیام کے لئے سررشتہ تعلیمات کو توجہ دلائی جائے۔

عبدالمجید صاحب ایم۔ اے نے اردو امتحانات علی گڑھ کے قیام سنٹر کے حصول اور امتحانات انجمن کی زیر نگرانی کی تحریک کی جس کو مستحسن اقدام قرار دیا اور ضروری کاروائی کی ذمہ داری انجمن نے لی۔ جلسہ کی دوسری کاروائی کا آغاز قاضی مولوی عبدالواحد صاحب کی صدارت میں بشکل مشاعرہ ہوا۔ علی حضری، محمد عثمان قادری قادر، ڈاکٹر عزیز اور دیگر شعراء نے اپنا کلام سنا کر محظوظ کیا۔ اس جلسہ میں ہمدردان اردو ایڈوکیٹس کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ علی حضری کے شکریہ پر جلسہ اختتام کو پہنچا۔

• رہنمائے دکن

اردو کے لئے مسلسل جدوجہد کی ضرورت

رائچور :- انجمن ترقی اردو رائچور کی عاملہ کا اجلاس ۱۰ر اکتوبر کو دفتر انجمن میں منعقد ہوا۔ جناب سریندر لال لاہوٹی آرگنائزنگ سکریٹری انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے اراکین عاملہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ انجمن کے عہدہ داروں کو اردو کا خادم تصور کرتے ہوئے مساعی انجام دینا چاہئے۔

جناب لاہوٹی نے کہا کہ اردو مسلمانوں کی نہیں بلکہ سارے ہندوستانیوں کی مشترکہ زبان ہے۔ اس کے مسائل کی یکسوئی کے لئے مشترکہ مساعی اور کاوش ناگزیر ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج اردو کو درپیش مسائل کی یکسوئی وقت کا تقاضہ ہے اور اس سلسلہ میں جہد مسلسل کی ضرورت ہے۔ بعد ازاں جناب لاہوٹی نے اردو ہال رائچور کے لئے انجمن کی جانب سے حاصل کردہ اراضی کا معائنہ کیا۔

• نامہ نگار

(باقی صفحہ ۵ سے آگے)

ضرب الامثال کا لفظی ترجمہ کیا گیا ہے۔ لیکن کہیں کہیں اردو الفاظ ہی استعمال کرتے ہوئے فٹ نوٹ میں تشریح کر دی گئی ہے جیسے دال میں کچھ کالا ہے کا ترجمہ متن میں یوں کیا گیا ہے THERE IS SOME THING IN THE DAL اور فٹ نوٹ میں دال کے انگریزی معنی دئیے گئے ہیں۔

اسمائے خاص کو اکثر جگہ ترجمہ میں بجنسہ نقل کرتے ہوئے ضروری موقعوں پر فٹ نوٹس میں تشریح کی گئی ہے لیکن قرآن شریف کی سورتوں کے ناموں کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا گیا ہے جیسے والمحصنات کے بجائے GOOD WOMEN استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح کتاب الوان نعمت کا ترجمہ A VARIETY OF DAINTY DISHES کیا گیا ہے۔ بعض جگہ محاوروں اور اسمائے خاص یا اشعار کو رومن میں لکھ دیا گیا ہے جیسے یہ شعر رومن میں لکھا گیا ہے ؎

یا مکن باپیل بانان دوستی
یا بنا کن خانۂ درخورد پیل

پاجامہ کو کہیں پائجامہ لکھا گیا ہے کہیں TROUSERS گل کھلائیگی کا ترجمہ SHE WILL MAKE BIGGER ROSES BLOSSOM. کیا گیا ہے۔

سدھی کے لفظ کے معنی دیتے ہوئے فٹ نوٹ میں لکھا ہے کہ انگریزی میں اس کے مماثل کوئی لفظ نہیں ہے۔ انگریزی کتابوں کے اردو ترجموں کے متعلق تو کافی کام ہو چکا ہے۔ مگر اردو کتابوں کے انگریزی ترجموں کے متعلق ابھی بہت کچھ کام کی گنجائش ہے اور یہ شاید ریسرچ کا موضوع بھی بن سکتا ہے۔

اخبار و اذکار

حلقہ ارباب ادب بھوپال کی تقریبات کا پروگرام

بھوپال :۔ مدھیہ پردیش کی ما حیدھا کی ادبی انجمن "حلقہ ارباب ادب" نے اپنی زندگی کے ۱۲ سال پورے کرنے پر شاندار تقریبات کے انعقاد کا پروگرام بنایا ہے۔

تقریبات کا مختصر سا خاکہ یہ ہے کہ "حلقہ" کی طرف سے تین مجموعے ترتیب دئے جائیں۔ پہلا تنقیدی مضامین اور تقاریر پر مشتمل ہو، دوسرا افسانوں کا اور تیسرا شعری مجموعہ ان کتابوں میں صرف وہی تخلیقات و تقاریر شامل ہوں گی جو "حلقہ" کے جلسوں اور کانفرنسوں میں ہوئیں۔ پہلے مجموعہ میں پروفیسر آل احمد سرور، جناب ہری ونایک پاشکر، جناب مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر رام بلاس شرما، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، جناب نیاز انصاری، جناب سجاد ظہیر، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، خواجہ احمد عباس، مولانا سعید رزمی، حکیم سید قمر الحسن، جناب کوثر چاندپوری اور دوسرے مقامی و غیر مقامی فنکاروں کے مضامین و تقاریر شامل ہوں گی۔ شعری مجموعہ میں مخدوم محی الدین، سردار جعفری، معین احسن جذبی، جاں نثار اختر، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری، اودھی جونپوری، غلام ربانی تاباں، کیفی اعظمی، سلام مچھلی شہری، اودھوکمار، رام کرشن شریواستو، مظفر شاہجہانپوری اور بھوپال کے نامور شعراء کے ساتھ نئی نسل کے نمائندہ شعراء کا کلام ہوگا۔

اس کے علاوہ مجلس مذاکرہ، حلقہ کی گزشتہ سرگرمیوں کی نمائش اور ایک سوونیر کی اشاعت بھی پروگرام میں شامل ہے۔ وقفہ وقفہ سے یہ تقریبات مختلف اوقات میں منعقد ہوں گی مقامی روزنامہ "ندیم" اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں ایک خصوصی شمارہ شائع کر رہا ہے۔

ان تقریبات کی ابتدائی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ پروفیسر آفاق احمد، پروفیسر حسن مسعود احمد پروفیسر شفیقہ فرحت پر مشتمل ایک کمیٹی ان تقریبات کو "حلقہ" کے شایان شان انعقاد کے لئے مصروف عمل ہے۔

• نامہ نگار

مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر میں

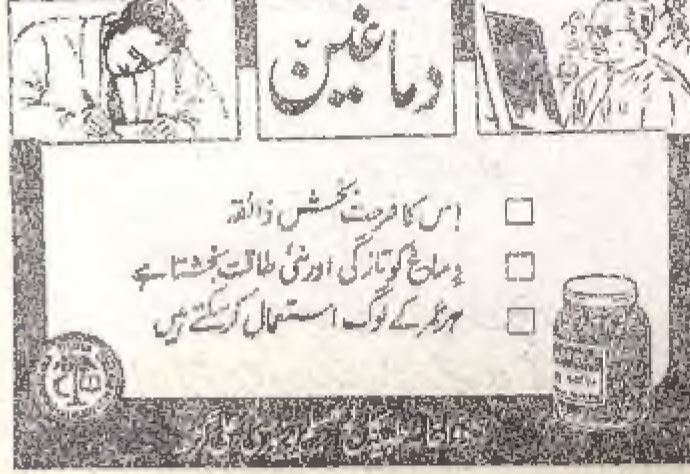
"گاندھی جی اور ہندوستانی" پر ایک مذاکرہ

بمبئی : مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر بمبئی میں گاندھی جی کو خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے اردو کے مشہور ادیب اور نقاد ڈاکٹر سید اعجاز حسین کی صدارت میں ایک مذاکرہ ہوا جس میں ڈاکٹر عبدالستار دلوی، ڈاکٹر شیام ورما، اور جناب سیٹھو مادھو راؤ پاگڑی نے حصہ لیا اس مذاکرہ کا موضوع "گاندھی جی اور ہندوستانی" تھا۔

مذاکرہ کی ابتدا ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے کی انھوں نے "ہندوستانی۔ قومی زبان کی حیثیت سے" کے عنوان سے مقالہ پڑھا جس میں انھوں نے اردو کے مختلف ناموں پر بحث کرتے ہوئے بتایا کہ کس طرح ایک ہی زبان وقتاً فوقتاً مختلف ناموں سے یاد کی گئی اور کبیر اور جائسی سے لے کر آج تک کس طرح اس کے ادبی سرمایہ میں مختلف سمتوں سے اضافے ہوتے رہے، اس سلسلہ میں انھوں نے گریرسن کی لسانی توضیحات کے پس منظر میں گاندھی جی کے لسانی نظریہ کی بھی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ آج بھی ہندوستانی کی اہمیت کیوں ہے؟ اور اس کی اشاعت کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر شیام ورما نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ اردو اور ہندی ایک ہی زبان کی دو شیلیاں ہیں۔ اختلاف ہے تو محض رسم خط کا، ناگری رسم خط آج بہت عام ہے وہ ادب، جو اردو رسم خط میں لکھا جاتا ہے ایک خاص حلقہ سے باہر نہیں نکل پاتا اس کے برعکس جو ادب ناگری رسم خط میں شائع ہوتا ہے وہ ہندوستان بھر میں پھیل جاتا ہے اس لئے اردو والوں کے لئے یہ اچھی بات ہوگی کہ وہ اپنا رسم خط چھوڑ دیں اور ناگری رسم خط اختیار کریں۔ ہندی والے اردو کے سارے ادبی سرمایہ کو اپنانے کے لئے تیار ہیں۔

جناب سیٹھو مادھو راؤ پاگڑی نے آزادی سے پہلے زبان کے سلسلہ میں جو نظریاتی و عملی اختلافات تھے ان کا جائزہ لیا اور اپنے ذاتی مشاہدات کی روشنی میں بتایا کہ اگر ماضی میں اردو والوں نے حیدرآباد وغیرہ میں اردو کی اشاعت کے سلسلے میں سختی سے



کام لیا اور اردو کو عربی و فارسی کے رنگ میں رنگ دیا تو اب ہندی والے وہی حرکت کر رہے ہیں اور ہندی کو اس قدر سنسکرت آمیز بنا رہے ہیں کہ عام آدمی اس کو سمجھ نہیں پاتا۔ انھوں نے کہا یہ دعویٰ کرنا کہ محض رسم خط کے بدلنے سے زبان ترقی کر لیتی ہے یا تعلیم کا اوسط بڑھ جاتا ہے درست نہیں۔ رسم خط سے زیادہ سیاسی و معاشی عوامل ایسے وقت میں زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ ہمیں کسی زبان کو اس کے رسم خط سے دست بردار ہو جانے کی تلقین کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ ہمارے دستور نے ساری زبانوں کو زندہ رہنے کا حق دیا ہے اور وہ اپنے اپنے بل بوتے پر زندہ رہیں گی۔

ڈاکٹر اعجاز حسین نے بھی اپنی صدارتی تقریر میں رسم خط چھوڑ دینے کی تلقین کو ناپسندیدہ قرار دیا۔ انھوں نے فرمایا اگر کوئی شیروانی یا پاجامہ پہنتا ہے تو آپ کیوں اصرار کرتے ہیں کہ وہ بش شرٹ اور پتلون پہنے؟ انھوں نے بھی اپنے ذاتی مشاہدات کی روشنی میں بتایا کہ ہمیں اس وقت جب حیدرآباد میں اردو کی اشاعت کے لئے مبالغہ سے کام لیا جا رہا تھا خود یو۔پی اور بہار میں ہندی کی اشاعت کے لئے تشدد سے کام لیا گیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہندی والے دعویٰ تو بہت کرتے ہیں کہ اگر رسم خط تبدیل ہو جائے تو ہم اردو کے سارے ادبی سرمایہ کو اپنا لیں گے اور حال یہ ہے کہ ان کی ادبی تاریخوں میں اردو کا تو ذکر ہی کیا میر، سودا، غالب جیسے اہم اردو شاعروں کا بھی نام تک نہیں ملتا۔ انھوں نے دائرۂ اثر کے بڑھنے کی بات کو بھی غلط قرار دیا۔ انھوں نے کہا دائرۂ اثر ہی بڑھانا ہے تو رومن، جرمن اور دوسرے رسم خط کیوں نہیں، ناگری ہی کیوں؟

شکریہ ادا کرنے کا فریضہ حامد اللہ ندوی نے انجام دیا اور انھوں نے بحث کو ختم کرتے ہوئے کہا کہ ماضی میں بے شک دونوں طرف سے زیادتیاں ہوئیں۔ لیکن آزادی کے بعد ہندی سرکاری زبان بن چکی ہے اور ہندوستان بھر میں اس کی اشاعت کا سلسلہ سرکاری و غیر سرکاری دونوں سطحوں پر جاری ہے۔ اردو کا اس سے کوئی مقابلہ نہیں۔ پھر بھی اگر کوئی اس سے اس قسم کے مطالبے کرے تو غالب کی زبان میں یہی کہا جا سکتا ہے ؎

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہ گزر پہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

• عبد الستار دلوی

نئے زاویے کا تعزیتی جلسہ

نئے زاویے کی ایک تعزیتی نشست ۱۲؍ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو ڈاکٹر سلام سندیلوی کی قیام گاہ پر جناب پیام گورکھپوری کی صدارت میں ہوئی جس میں ڈاکٹر سلام سندیلوی نے عارف عباسی مرحوم کی حیات اور اُن کی شاعری کے عنوان سے ایک تقریر کی۔ سید اظہار ایم۔ کے۔ ضیاء دی رانچی نے عارف عباسی مرحوم کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔

آخر میں صدر جلسہ پیام گورکھپوری صاحب نے عارف مرحوم کی ادبی شخصیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ان کی وفات کو شعری ادب کا نقصان عظیم بتایا۔

اس تقریر کے بعد تعزیتی تجویز پیش کی گئی جس کو حاضرین جلسہ نے بالاتفاق منظور کیا۔

• مہیش اشک

منظر صدیقی اکبرآبادی کی وفات

بمبئی:- کراچی (پاکستان) سے موصولہ تار اور خط کے مطابق ۲۰؍ اکتوبر ۱۹۹۱ء کو سنیچر کی شب میں اعجاز صدیقی (مدیر 'شاعر' بمبئی) کے برادر بزرگ منظر صدیقی اکبرآبادی کا ۶۳ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

منظر صدیقی، مولانا سیماب اکبرآبادی کے سب سے بڑے صاحبزادے اور ایک مشہور و ممتاز شاعر و صحافی تھے۔ مرحوم عرصے سے ضیق النفس کے مریض تھے۔ حکومت پاکستان کی طرف سے انھیں ماہانہ ادبی وظیفہ ملتا تھا۔

۱۹۳۲ء میں آگرہ سے ماہنامہ "شاعر" منظر صدیقی ہی کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ قصر الادب سے شائع ہونے والے ماہنامہ "پیمانہ" اور ہفتہ وار "تاج" بھی اُن ہی کے زیر اہتمام شائع ہوتے تھے۔ ملک کی تقسیم سے پہلے تک آگرہ سے ماہنامہ "کنول" اور ہفت روزہ "ایشیا" ان کے اپنے ذاتی پرچے نکلتے تھے۔ شعر و ادب میں منظر صدیقی مرحوم کی ایک مستند حیثیت تھی۔ نظم و نثر کا ایک بڑا ذخیرہ مرحوم نے اپنی یادگار چھوڑا ہے۔

پسماندگان میں بیگم منظر کے علاوہ دو صاحبزادے اور چھ صاحبزادیاں ہیں۔

• مکتبہ شاعر

(صفحہ ۱۲ سے آگے)

۱۸۵۷ء تک بلکہ اس کے چند سال بعد تک وہ اس بات کو مسلمات میں شمار کرتے رہے کہ اردو بلا اختلاف مذہب وملت شمالی ہند کے تمام لوگوں کی تعلیمی وتہذیبی زبان ہے۔ اپنی تحریروں میں "ورناکلر" کے لفظ سے وہ ہمیشہ اردو ہی مراد لیتے ہیں۔ ۱۸۶۲ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تو یہی بات پیش نظر رہی کہ اردو کے ذریعے مغربی علوم کو عام کیا جائے۔ ۱۸۶۷ء میں ورناکلر یونیورسٹی کی اسکیم گورنمنٹ کو پیش کی تو یہی مقصود تھا کہ کلکتہ یونیورسٹی کی ایک فیکلٹی کے طور پر "اردو یونیورسٹی" کا قیام عمل میں آجائے۔

ہرچند اردو نے ایم۔ اے۔ او کالج میں ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے شکست کھائی جبکہ اس کا اردو شعبہ چند سال تک ہچکولے کھا کر جینے کے بعد بالآخر ۱۸۸۶ء میں بند کر دیا گیا۔ تاہم اردو علی گڑھ تحریک کی اساس رہی اور تہذیب الاخلاق انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور دیگر مطبوعات کے ذریعے اردو کو مسلسل مالا مال کرتے رہنے کی کوشش یہاں جاری رہی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب اردو پر چاروں طرف سے حملے ہونے لگے اور خود سرکار اس بارے میں ڈانواں ڈول نظر آنے لگی تو بوڑھے سرسید اس کے تحفظ کے لئے سینہ سپر ہو گئے۔ جس قدر "اردو ہٹاؤ" کی تحریک زور پکڑتی گئی سرسید "اردو بچاؤ" کے لئے سرگرم عمل ہوتے گئے۔ ان کے خیال میں اردو سے بے وفائی اس مقدس سمجھوتے سے بے وفائی تھی جو ازمنہ وسطیٰ میں لسانی سطح پر ہوا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ رجعت پسندوں کا یہ وار ہماری ملی جلی تہذیب پر سب سے کاری وار ہے اور اس کو بچا کر تاریخ کے ایک تہذیبی توازن کو بچایا جا سکتا ہے۔ اردو کے حلقے میں ان کا آخری معرکۃ الآرا بیان ان کے انتقال کے کچھ روز بعد شائع ہوا۔ یہ آج اردو دانوں کے لئے عبرت کی ایک دستاویز ہے۔

یہ کہنا دشوار ہے کہ سرسید نے اردو کے محاذ پر کہاں تک کامیابی حاصل کی لیکن یہ مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا۔

اس محسن کا قرض اس ادارہ پر اور ہماری نسل پر اب تک باقی ہے۔

زبان سے زیادہ سرسید نے اردو ادب کے محاذ پر کامیابی حاصل کی۔ سچ ہے کہ جدید نثر فورٹ ولیم، مرحوم دہلی کالج، اور غالب کے خطوط میں فروغ پا چکی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ "وہ جدید نثر جس کے دامن میں علوم کی سمائی ہو، جو روح عصر اور نئی فکر سے آشنا ہو سرسید ہی کی صاف وشفاف، کھُردری بلکہ بعض اوقات کھُردری عبارت میں ملتی ہے۔ تہذیب الاخلاق ہی کے صفحات پر نئی علمی نثر نے جنم لیا ہے، وہ نثر جس میں سیاسی، اخلاقی اور علمی خیالات کے اظہار کی توانائی تھی۔ سرسید نے بہت جلد اپنے اردگرد ایک ادبی نظام شمسی قائم کر لیا۔ حالی ہوں کہ شبلی، محسن الملک ہوں کہ وقار الملک، نذیر احمد ہوں کہ چراغ علی، سبھی کے چراغ اسی شمع سے روشن ہوئے تھے جو علی گڑھ کے بام ودر میں جل رہی تھی۔

سرسید نے صحیح معنوں میں اردو ادب کو دہلی و لکھنؤ کے تنگنائے سے نکال کر اس پر علی گڑھ کا ٹھپہ لگایا۔ یہ ٹھپہ عبارت ہے ایک وسیع تر زبان اور ایک قوی تر نثری طرز تحریر سے۔

حضرات! میں اس حکایت لذیذ کے آخری حصے تک آ پہنچا ہوں۔ لیکن اپنی تقریر ختم کرنے سے قبل میں ان ذاتی تاثرات کے اظہار سے باز نہیں رہ سکتا جو اس دیوزاد شخصیت نے میرے ذہن پر مرتسم کئے ہیں۔ سرسید کی عظمت میرے لئے عبارت ہے پکی دھن، گہری لگن اور ان تھک محنت سے۔ یہ عبارت ہے کلمہ حق، جرأت بے باک اور ایمان راسخ سے۔ یہ مشتمل ہے تدبیر، حکمت عملی، اصابت رائے اور معتدل ومتوازن انداز فکر پر۔ اور سب سے آخر میں یہ مرکب ہے اس سوز دروں سے جس نے انھیں اپنی احسان فراموش جماعت کی خدمت پر مامور رکھا اس قرآنی تصور ویقین کے ساتھ کہ جو یہ کرتے ہیں یہ نہیں جانتے۔

عظمت کا یہ نقش اور گہرا ہو جاتا ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ قوم نے اس مصلح اعظم کی کس پذیرائی کی۔

حضرات! آج آپ جس سرسید کے گن گاتے ہیں، جسے آپ محسن اعظم کے نام سے یاد کرتے ہیں، جس کی قبر پر عقیدت کی چادر گل چڑھاتے ہیں اس کو از روئے فتاویٰ مکہ و دیوبند ملت کا سب سے بڑا ملحد، کافر، زندیق اور نیچری کہا گیا تھا۔ اور ایک فتوے کے ذریعے یہ حکم دیا گیا تھا کہ اسے سنگسار کیا! اس کے بنائے ہوئے ادارہ کو مسمار کر دو! لیکن یہ ملحد وکافر جواب میں یہی کہتا رہا: "دوستو! میں نے یہ مانا کہ میں کافر ہوں لیکن کیا تم ایک کافر کو اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے کہ وہ اپنی قوم کی خدمت کرے!" اس کی اس عرضداشت پر کسی نے کان نہ دیا اور اس کے دسترخوان پر بعض لوگوں نے کھانا صرف اس لئے گوارا نہیں کیا کہ وہ اہل کتاب کا ہم طعام تھا۔ طعن وتشنیع کی مسلسل بوچھار نے خود اس کے بقول اس کا حال اس بڑھیا کا سا بنا دیا تھا جسے محلے کے لونڈے ہر وقت چھیڑتے تھے۔ لیکن جس دن کوئی چھیڑنے والا نہ ہوتا تو وہ ان کو کوستی اور کہتی ــ کیا آج محلے کے سارے لونڈے مر گئے ہیں؟

حضرات! محلے کے یہ لونڈے مر نہیں گئے تھے بلکہ راہ راست پر آ گئے تھے۔ جوں جوں سرسید کے کام کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہوگا ان کے ساتھ ایک کارواں بنتا گیا لیکن میر منزل کو پایان کار تک پہنچنے کے لئے کیا کچھ جھیلنا اور سہنا پڑا۔ علی گڑھ کا مورخ اس داستان راز کو کبھی نہیں کھولے گا۔

حضرات! سرسید پر کوئی گفتگو اختتام تک نہیں پہنچ سکتی جب تک ان کے ذکر کے بعد اس ادارہ کا تذکرہ نہ کیا جائے جس کی آبیاری

پروفیسر مسعود حسین خاں

سیر اصغر

یوم سرسید

(ایک تقریر کی یادداشت)

آج ہم ایک ایسی عظیم شخصیت کے یوم پیدائش کی خوشی میں یہاں جمع ہوئے ہیں، جو نہ صرف جدید ہندوستان کا ایک بڑا انسان ہے بلکہ جس سے ہماری نسبت خصوصی یہ ہے کہ وہ ہمارا محسن اعظم ہے۔ اسی نے ہمارے اس چمن کی داغ بیل ڈالی اور پھر تقریباً ایک چوتھائی صدی تک اپنے خون جگر سے اس کی آبیاری کی۔ اس کے احسانات کے نیچے ہماری تین یا چار نسلیں دبی ہوئی ہیں۔ ہمارے اور اس کے درمیان جس قدر فاصلہ زمانی بڑھتا جا رہا ہے اس کے احسانات سے ہم گراں بار ہوتے جا رہے ہیں گو ہم اپنی کم علمی اور نادانی کی وجہ سے سبک سر بن کر خود کو ان سے سبکسار سمجھنے لگے ہیں!

آج ہی کی تاریخ کو، آج سے ایک سو چوّن سال قبل اس برگزیدہ ہستی نے دلی کے ایک معزز گھرانے میں جنم لیا تھا۔ یہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ نومولود کی آمد پر اس کی شخصیت کا پہلا تاثر جو اس کے دادا جان کے ذہن پر مرتب ہوا تھا وہ عجیب و غریب تھا۔ دادا نے جب اس تندرست اور لمبے تڑنگے پوتے کو پہلی بار دیکھا تو بول اٹھے "آج ہمارے گھر میں ایک جاٹ پیدا ہوا ہے"۔

ان کا یہ تاثر مجھے ہمیشہ محظوظ کرتا رہا ہے۔ سرسید کی شخصیت کا تجزیہ کیجئے تو اس میں جاٹوں کی سی بہت سی صفات نظر آئیں گی۔ وہی بھاری بھرکم ڈیل ڈول، وہی جاہ و جلال، مرعوب کن لہجہ اور پاٹ دار آواز۔ مقاصد کے حصول کے لئے وہی مثبت ضد جسے دھن اور لگن کہا جاتا ہے۔ کھرے، کھردرے ہونے کی حد تک بات کے پکّے، کام کے سچّے، صاحب صفا، صاحب عصا۔

لیکن سرسید نے جاٹوں سے کچھ زیادہ بھی پایا تھا۔ ان کے پاس ایک عجیب و غریب جدید ذہن بھی تھا جو اپنی حقیقت پسندی اور آزادیٔ فکر کی بناء پر مستقبل قریب و بعید کے پار تک دیکھ سکتا تھا، جو مصلحت بیں تھا لیکن جسے مصلحت پرست نہیں کہا جا سکتا، جو وقت کی صدا کو پہچانتا تھا لیکن جس پر ابن الوقت ہونے کی تہمت نہیں تراشی جا سکتی۔

حضرات! اس مختصر سی مدت اور تقریر میں میرے لئے ممکن نہیں کہ میں سرسید کے کارناموں کی تفصیلات آپ کے سامنے پیش کر سکوں کہ وہ نصف صدی سے زائد پر حاوی ہیں اور پہلودار ہیں۔ بس یوں سمجھئے سرسید کا کارنامہ ہم سب ہیں۔ آپ کا وجود ہے، میرا وجود ہے، ان در و دیوار کا وجود ہے جو نہایت پر اسرار انداز میں آج خاموش تماشائی بن کر ہماری باتوں کو سن رہے ہیں۔

سرسید کے کارنامے ایک دو نہیں جنھیں گنا کر ختم کیا جائے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی شکست و ریخت کے بعد انھیں اس ملک کی سب سے بڑی اور پس ماندہ اقلیت کے تحفظ و بقا کے لئے قومی زندگی کے ہر ہر محاذ پر کام کرنا پڑا تھا۔ حقیقت پسندی سے کام لے کر انھوں نے سیاسی محاذ پر فاتحین سے سمجھوتہ کیا۔ فاتح اور مفتوح کے درمیان نفرت کی جو خلیج پیدا ہو گئی تھی اسے پاٹنے کے لئے ایسے جتن کئے کہ خودداری کو ٹھیس لگے بغیر اعتماد حاصل ہو جائے۔ انگریزوں سے نفرت کی بناء پر انگریزی زبان اور مغربی علوم سے جو منافرت پیدا ہو گئی تھی اسے دور کرنے کے لئے نیا تعلیمی منصوبہ بنایا۔ اسلامی مذہبی فکر میں اجتہاد سے کام لے کر اور اسلام جیسے فطری مذہب کو فطرت کے عین مطابق دکھا کر اسلامیوں کو علوم عقلی اور سائنس کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ زوال پذیر مغلیہ سلطنت کے دور میں مسلمانوں میں جو اخلاقی انحطاط پیدا ہو گیا تھا اس کے اسباب و علل پر غور کر کے ان کی اصلاح کی کوشش کی اور یورپ سے واپسی پر رسالہ تہذیب الاخلاق کا اجراء اسی مقصد سے کیا۔ اردو ادب جو بقول حالی ایک ناپاک دفتر بن کر رہ گیا تھا اسے غزل اور افسانوی ادب کے تنگنائے سے نکال کر ایک وسیع اصلاحی، اخلاقی اور سیاسی فکر سے دوچار کیا اور زبان کا کینڈا اس طرح بدل کر رکھ دیا کہ ایک جست میں اردو نثر باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کی خیال آرائیوں سے نکل کر تہذیب الاخلاق کی سنجیدہ علمی نثر میں تبدیل ہو گئی۔

غرضکہ سرسید کی زندگی ایک معروف اور بھرپور زندگی تھی۔ ایک قومی ناخدا کی طرح ان کی نظر میں اجتماعی زندگی کی تمام جزئیات تھیں۔ مسلمانوں کے نشاۃ الثانیہ کے لئے کوئی تدبیر ایسی نہ تھی جو اس آزمودہ کار نے نہ آزمائی ہو اور کوئی تصویر ایسی نہ رہی جہاں اس قلم کار کا قلم نہ لگا ہو۔ میرے دوسرے ساتھی سرسید کی سیاسی اور اصلاحی فکر پر بہتر روشنی ڈال سکیں گے۔ میں ان کے ہمہ گیر ذہن کی صرف ایک مصروفیت کا تفصیل سے تذکرہ کرنا چاہوں گا یعنی اردو زبان اور ادب۔ یہ بھی ان کے ہمہ جہتی اصلاحی پروگرام کا ایک حصہ رہا ہے اور مرتے دم تک ان کے لئے ان کا خامہ خونچکاں اور انگلیاں خوں چکاں رہیں۔

اردو سرسید کی سرشت میں اسی طرح جاگزیں تھی جس طرح فولاد میں جوہر۔ انھوں نے اسی کے ماحول میں آنکھ کھولی اور شمالی ہند کی بولیوں کی کثرت کے درمیان اسی کو سررشتۂ وحدت سمجھا۔

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا

REGD-NO-L. 922	فون نمبر ۲۹	R. NO. 2186/57